مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ کی تفسیرِ ثنائی کا اجمالی جائزہ

An overview of Tafseer-e- Sanai by Maulana Sana-Ullah

☆ پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

Abstract:

Tafseer-e-Sanai is a brief exagies of Holy Quran which was written by Moulana Sana Ullah Amratsari (D: 1948). It has eight short volumes but has been separated in two compilations the first one has four volumes (1-4) & the second one (5-8) has also four volumes. First edition was published in 1313, Hijri & had been completed in 1349 Hijri i.e in 1931. This work was completed in 36 years. First volume of this tafseer was published in the life time of Sir Syed Ahmed Khan, but also it was sent to him. That's why in its early volumes, there were so many answers in response to Sir Syed's thoughts. It is worth mentioning that Moulana Amratsari has responded in a good manner to Sir Syed. Moulana was affiliated with the sect of Ahle-Hadees but after attaining the education from different institutions several of sects like, Darul Uloom Deoband & Madarsa-e-Kanpur, (i.e Deobandi & Brailvi), Moulana had been freed from any single sect. He is known as a scholar of Islam, this tafseer is a witness of it. The Style & method of writing Tafseer is very unique that is why its style was adopted by a known scholar, Moulana Ashraf Ali thanvi and Moulana Abdul Qadeer Siddiqi's translation was also inspired by it. The Quranic letters (حروفِ مقطعات) are mentioned with meanings in it and 28 translations of (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) are also determined in different places in the beginning of Surah.

☆ ڈین، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کراچی، ڈائریکٹر سیرت چیئر، جامعہ کراچی۔

(1)

تفسیرِ ثنائی، آٹھ مختصر جلدوں پر مشتمل، مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ (متوفی 1948ء) کی تفسیر ہے۔ جسے اب دو حصوں میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ حصہ اوّل میں ابتدائی چار جلدیں اور حصہ دوم میں باقی کی چار جلدیں جمع ہیں۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ 1313ھ میں طبع ہوئی تھی۔[۱] اور 29 رمضان المبارک 1349ھ بمطابق 18 رفروری 1931ء کو اس تفسیر کا اختتام ہوا۔[۱] گویا تقریباً چھتیس (36) سال میں یہ تفسیر مکمل ہوئی۔ تفسیر کے اختتام پر مولانا امرتسریؒ نے خود لکھا ہے کہ ''تفسیرِ ثنائی سالہا سال میں پوری ہوئی۔ اتنے سالوں کا کام نہ تھا مگر اور کام مثل تالیفِ کتبِ مناظرات وغیرہا کی وجہ سے عدیم الفرصتی رہی اس لئے طول ہو گیا۔ عفی اللہ عنّی۔[۳]

اس کی پہلی جلد سر سید احمد خانؒ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔ بلکہ یہ جلد ان کو پہنچ چکی تھی۔ ثناءاللہ امرتسریؒ نے لکھا ہے ''طبعِ اوّل تفسیرِ ہٰذا سر سید مرحوم کی زندگی میں ہوا تھا۔ اور یہ جلد ان کو پہنچ چکی تھی۔ ہم بگمانِ حسنِ خاتمہ دعاء کرتے ہیں۔ ربنا اغفرلنا و لا خواننا الذین سبقونا بالایمان''.[۴] میرے پیشِ نظر جو مطبوعہ ہے، وہ میر محمد، کتب خانہ آرام باغ کراچی کا ہے۔ یہ اصل میں پرانی اشاعت ہے، جسے طبعِ نو میں ایضاً چھاپا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ سنِ اشاعت درج نہیں کیا۔ البتہ جلد کے اندرونِ سرِ ورق پر سالِ اشاعت ۱۳۵۰ھ بمطابق دسمبر ۱۹۳۱ء لکھا ہوا ہے.....اس مضمون میں تمام حوالے (تفسیرِ ثنائی کے) اسی تفسیر کے مطابق درج ہیں، جو یقیناً کسی اور اشاعت میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام قرآنی آیات کے ماتحت ہیں۔ اس لئے کسی دوسرے ایڈیشن میں انہیں انہی آیات کے تحت دیکھنا ذرا بھی مشکل نہیں۔

تفسیر میں ایک خامی کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس میں قرآنی آیات کو نمبرات و نشانات کے بغیر لکھا گیا ہے۔ جس سے تلاشِ حوالہ اور بروقت حصولِ افادہ میں دشواری پیش آتی ہے۔ کاش کوئی صاحبِ ذوق اس طرف بھی توجہ دے اور تفسیرِ ہٰذا کو جدید اسلوب میں ترتیب دے کر شائع کرا دے۔ بلاشبہ یہ امتِ مُسلمہ کے اردو خوان طبقے پر احسانِ عظیم ہوگا۔

تفسیرِ ثنائی اس انداز میں مرتب ہوئی ہے کہ مولاناؒ نے آیاتِ کریمہ کے ذیل میں پہلے ترجمہ لکھا ہے۔ جیسا کہ بالعموم رواج ہے۔ پھر برابر کے آدھے صفحے کے کالم میں مربوط اور مسلسل مختصر تفسیر یا تفسیری ترجمہ اور قابلِ وضاحت باتوں کو نیچے حواشی کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اس التزام و اہتمام سے یہ تفسیر مکمل کی گئی ہے۔

(2)

مولانا امرتسریؒ نے تین مختلف مکاتبِ فکر کے مدرسوں سے کسبِ فیض کیا تھا۔ سب سے پہلے اہلحدیث مکتب سے پھر دارالعلوم دیوبند سے اور آخر میں مدرسہ فیضِ عام کانپور سے۔ مولانا نے مدرسۂ فیضِ عام کانپور میں اپنے پڑھنے کا ذکر خود اپنی تفسیر میں بھی کیا ہے۔ (۵) مختلف مکاتب میں پڑھنے کی وجہ سے مولانا کی فکر میں وسعت، پختگی، اور تحقیق کا عنصر غالب رہا۔ اہلحدیث ہونے کے باوجود وہ ''اہلحدیث'' نہیں رہے۔ ان کی پہچان علمی گہرائی اور وسعتِ نظری بنی۔ ان دعوؤں کے ثبوت میں تفسیر ثنائی دیکھی جاسکتی ہے۔

(3)

مولانا نے اپنی تفسیر کے لکھنے کا سبب یہ بتایا ہے:

> ''اس تفسیر کے لکھنے کا مجھے دو وجہ سے خیال پیدا ہوا۔ ایک تو میں نے دیکھا کہ مسلمان عموماً فہمِ قرآن شریف سے ناواقف بلکہ شناختِ حروف سے بھی نا آشنا ہیں ایسے وقت میں عربی تصانیف سے ان کا فائدہ اٹھانا قریب محال ہے۔ اردو تفاسیر سے بھی بوجہ کسی قدر طوالت کے عام لوگ مستفید نہیں ہوسکتے۔ نیز ان کا طرزِ بیان خاص طریق پر ہے۔
>
> دوم- میں نے مخالفین کے حال پر غور کیا تو باوجود بے علمی اور ہیچ مدانی کے مدعیٔ ہمہ دانی پایا۔ خدا کی پاک کتاب پر منہ کھول کھول کر معترض ہورہے ہیں۔ حالانکہ کُل سرمایہ ان کا سوائے تراجم اردو کے کچھ بھی نہیں، جس میں سے بعض تو تحتِ لفظی ہیں اور اس کے محاورات بھی انقلابِ زمانہ سے منقلب ہوگئے۔ اس لئے وہ بھی مطلب بتانے سے عاری ہیں.....''(۶)

وجوہِ تفسیر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کو بزبانِ اردو، ایک بیانِ مسلسل کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے آج تک اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اس لئے مجھے اس کا خیال آیا۔ مولانا نے دعویٰ کیا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی اکرمہ اللہ نے انہی کی اتباع کرتے ہوئے اپنے ترجمے میں یہ طرزِ بیان

اختیار کیا ہے۔ واضح رہے کہ انہوں نے یہ دعویٰ خود مولانا تھانویؒ کی زندگی میں کیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر بیان القرآن مع ترجمہ کے مولانا امرتسریؒ کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی اور وہ اسے ملاحظہ فرما چکے تھے۔ (۷)

اب تفسیرِ ثنائی کے تعلق سے کچھ باتیں مولانا امرتسریؒ کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

''میرا یہ طرزِ بیان مجھ سے پہلے اردو تفاسیر میں نہیں آیا۔ جس نے اختیار کیا (جیسے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ اکرمھم اللّٰہ) وہ میرے بعد غالباً دیکھ کر کیا ہے۔ اس لئے مجھے خوشی ہے کہ

؎ لے اڑی طرزِ فغاں
بلبلِ نالاں ہم سے
گُل نے سیکھی روشِ
چاک گریباں ہم سے

لیکن عربی میں اس کا کسی قدر تفسیرِ رحمانی نمونہ ہو سکتی ہے۔ گو بعد تامّل اس میں اور اُس میں فرق ہے۔ چونکہ میری غرض صرف یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے عوام مسلمان اپنی اپنی سمجھ کے موافق کچھ حصہ لیں۔ اس لئے میں نے حواشی کو اصل تفسیر سے الگ کر کے اختلافِ قرأت وغیرہ کے مباحث بھی نہیں لکھے۔ کیونکہ موجودہ قرأت ہر حال میں مسلّم اور معتبر ہے۔

چونکہ میری غرضِ اصلی اس تحریر سے صرف یہ ہے کہ عوام اہلِ اسلام قرآنِ کریم کے مطالب سے واقف اور آگاہ ہوں۔ اس لئے میں نے ترجمہ کرتے ہوئے الفاظِ عربیہ کی پابندی نہیں کی۔ یعنی یہ نہیں کہ جو لفظ پیچھے ہو، اس کا ترجمہ بھی پیچھے کروں۔ بلکہ عربی محاورہ کو ہندی محاورہ میں لایا ہوں۔ اس امر کی پابندی بھی نہیں کی کہ جملۂ اسمیہ کا ترجمہ اسمیہ ہی میں ادا کروں۔ بلکہ مطلب اس کا جس جملہ

میں باعتبار محاورۂ اُردو کے پایا ادا کر دیا ہے۔ بعض جگہ واؤ کو سرِ
کلام سمجھ کر اس کا ترجمہ نہیں کیا۔ غرض جو کچھ کیا وہ اسی غرض سے کیا
کہ اردو میں با محاورہ کلام ہو۔"(۸)

(4)

مولانا امرتسریؒ بڑے عاشقِ رسول تھے۔ ان کی اکثر تحریریں اس امر کی گواہ ہیں۔ انہوں نے "رنگیلا رسول" کے جواب میں "مقدس رسول" نامی کتاب لکھی، جو بہت مشہور ہوئی۔ وہ اپنی تفسیر میں آنحضرت ﷺ کا جب ذکر کرتے ہیں تو اس میں آپ کے لیئے فداہ ابی واُمّی یا فداہ رُوحی کے الفاظ کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔(۹) بطور مثال ملاحظہ ہو۔ "کچھ شک نہیں کہ یہ پیشن گوئی پیغمبرِ خدا محمد مصطفیٰ محی عبادتِ واحد مطلق فداہ ابی واُمّی علیہ الصلوٰۃ کے حق میں ہے۔(۱۰)

مولانا نے اپنی تفسیر کا مقدمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کے تعلق سے لکھا ہے جس میں آپ کی نبوت کے ثبوت میں چار دلیلوں کو پیش کیا ہے۔ یہ مقدمہ مختصر ضرور ہے مگر جامع ہے۔ گیارہ صفحات پر مشتمل اس مقدمے کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

"اس مقدمہ میں چند دلائل مختصرہ سے سید الانبیاء سند الاصفیاء محمد
مصطفٰے علیہ وعلیٰ آلہ التحیۃ والسلام کی نبوت کا ثبوت ہوگا۔ اس لئے
کہ ہر کتاب کے دیکھنے سے پہلے صاحبِ کتاب کی وجاہت کا لحاظ
بھی ضروری ہے۔"(۱۱)

(5)

مولانا امرتسریؒ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے متعدد ترجمے کیئے ہیں۔ جبکہ بالعموم اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ ایک بار جو کیا ہے۔ وہی ہر مقام پر دُہرایا ہے۔ اس ضمن میں متعدد مترجمین کے تراجم دیکھے جاسکتے ہیں۔ سر سید احمد خانؒ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ، مولانا محمود حسنؒ، محمد علی لاہوری، فتح محمد جالندھریؒ، سید محمد محدث کچھوچھویؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، علامہ احمد سعید کاظمیؒ، پیر محمد کرم شاہ الازھریؒ، اور ڈاکٹر محمد طاہر القادری وغیرہم...... نیز ابو الکلام آزادؒ اور امین احسن اصلاحیؒ نے تو صرف ایک بار ہی (سورۂ فاتحہ میں) بسم اللہ کا ترجمہ کیا ہے۔ باقی کی تمام سورتوں میں ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مولانا امرتسریؒ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اٹھائیس (۲۸) تراجم قدرے تغیّر وتبدل کے ساتھ اپنی تفسیر میں تحریر کئے ہیں۔انہوں نے اپنے تئیں اس آیت کے ترجمہ میں بوقلمونی اور تنوع پیدا کرنے کے لئے تغیّرِ لفظی اور کہیں اسلوب میں تبدیلی کا سہارا لیا ہے۔اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے تراجم میں ترادفِ الفاظ کا پہلو اختیار کرنے والے مولانا امرتسریؒ درج ذیل تیرہ سورتوں میں بسم اللہ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

النسآء،الفرقان،الشعراء،النمل،القصص،عنکبوت،الروم،لقمان،السجدہ،الاحزاب،الفاطر،یٰسین اور زمر۔

اب ذیل میں بطورِ نمونہ ان کے تین مختلف ترجمے ملاحظہ کیجئے۔

(۱)　شروع اللہ کے نام سے جو بڑا بخشنے والا،نہایت رحم والا ہے۔(سورۂ اخلاص،الفلق،الناس)

(۲)　خدا کے نام سے شروع جو بڑا مہربان،نہایت رحم کرنے والا ہے۔(الرحمٰن،الملک،القلم)

(۳)　اللہ کے نام سے شروع جو بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔(القریش،الکوثر،الکافرون)

مولانا امرتسریؒ کے مؤخر الذکر ترجمے کا تتبع،مولانا بریلویؒ کے ترجمے میں نظر آتا ہے۔کیونکہ مولانا بریلویؒ کا ترجمہ بھی سوائے ایک مقام کے (سورۂ انبیاء) لفظ اللہ سے شروع ہوتا ہے۔دیکھئے:

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان،رحم والا ہے۔(الِ عمران،النور،الفرقان)

بعض سورتوں میں رحمٰن ورحیم کے ترجمے میں ان دونوں بزرگوں کے ہاں کچھ فرق ہے۔اس مذکورہ لئے بالا مخصوص سورتوں کو حوالے میں ذکر کیا گیا ہے.....اسی طرح محمد علی لاہوری،مولانا ابوالکلام آزادؒ،مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ،علامہ احمد سعید کاظمیؒ،پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ،علامہ غلام رسول سعیدی،اور ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے تراجم بھی لفظ اللہ سے شروع ہوتے ہیں۔اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی دو سورتوں (سورۂ الانفال اور سورۂ ھود) میں بسم اللہ کا ترجمہ لفظ اللہ سے شروع کیا ہے۔

(6)

بالعموم ہمارے مترجمین حروفِ مقطعات کے ضمن میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔یعنی اپنے تراجم میں ان کے مطالب ومعارف اور مفاہیم ومرادات بیان نہیں کرتے بلکہ حروفِ مقطعات کو ترجمہ میں ایضاً لکھ دیتے ہیں۔مگر مولانا امرتسریؒ نے اپنے ترجمے میں حروفِ مقطعات کے مطالب ومُرادات بیان کئے ہیں۔مثلاً الٓمّٓ کا ترجمہ یوں کیا ہے۔میں ہوں اللہ بڑے علم والا۔اور حاشیہ میں لکھا ہے۔''ان حروف مقطعات کے معنیٰ بتلانے میں بہت ہی اختلاف ہوا۔جس کا مفصل ذکر تفسیر اتقان اور معالم میں مرقوم ہے۔میرے نزدیک صحیح وہ ہیں جو

ابنِ عباسؓ سے مروی ہیں کہ ہر ایک حرف اللہ کے نام اور صفت کا مظہر ہے۔اس لئے میں نے یہ ترجمہ جسے آپ دیکھ رہے ہیں، کیا ہے۔ یہ حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے۔''(۱۲)

پھر اس اصول پر مولانا نے دیگر حروفِ مقطعات کو اپنے انداز سے کھولا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد، ذاتِ خداوندی اور اس کی صفات کو لیا ہے۔ اکثر متکلم کے صیغے میں اور دو ایک جگہ غائب کے صیغے میں.....بجز دو مقامات کے کہ جہاں اس سے مراد بجائے ذات وصفاتِ خداوندی کے، بندۂ خدا اور انسانِ کامل کو لیا گیا ہے۔ اس طرح مولانا کا وہ اُصول ٹوٹ گیا ہے، جو انہوں نے الٓمٓ (سورۃ البقرہ) کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ایک بار پھر دیکھئے۔

''میرے نزدیک صحیح وہ ہیں، جو ابنِ عباسؓ سے مروی ہیں کہ ہر ایک حرف اللہ کے نام اور صفت کا مظہر ہے۔''(۱۳)

الٓمٓرٰ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں ہوں اللہ سب کچھ جانتا اور دیکھتا۔(۱۴) الٓرٰ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں ہوں اللہ سب کچھ دیکھتا۔(۱۵) کٓھٰیٰعٓصٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں اللہ ہی سب کو کافی، سب کا ہادی، سب کو امن دینے والا، سب پر غالب صادق القول ہوں۔(۱۶) طٰہٰ کا ترجمہ کیا ہے۔اے بندۂ خدا(۱۷) طٰسٓمٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں ہوں بڑی پاکی والا، سلامتی والا مالک(۱۸) طٰسٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں اللہ بڑا وسعت والا پاک ہوں(۱۹) لیکن سورۂ قصص میں طٰسٓمٓ کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ میں ہوں اللہ بڑی تونگری والا، پاک وسلامتی والا۔(۲۰) حٰمٓ کا ترجمہ کیا ہے۔اللہ بڑا رحم کرنے والا بڑا مہربان ہے۔(۲۱) حٰمٓ o عٓسٓقٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں ہوں اللہ رحمٰن، رحیم، علیمِ کل، ستّارِ عُیوب، قادرِ مطلق،(۲۲) صٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں بڑا صادق ہوں۔(۲۳) نٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں رحمان ہوں(۲۴) قٓ کا ترجمہ کیا ہے۔ میں خدا قادر ہوں۔اور تفسیری ترجمہ میں لکھا ہے میں خدا قادر وقیوم ہوں۔(۲۵) اور ایک جگہ حٰمٓ کا ترجمہ کیا ہے۔وہ رحمٰن ورحیم ہے''۔(۲۶)

(7)

مولانا امرتسریؒ نے سورۂ اٰلِ عمران کی ابتداء میں شانِ نزول کے عنوان سے نجران کے عیسائیوں کا وہ واقعہ قلمبند کیا ہے، جب انہوں نے اپنے طریق پر مسجدِ نبوی ﷺ میں ہی آنحضرت ﷺ کی اجازت سے نماز ادا کی تھی۔اس پر مولانا کا تبصرہ ان کے فکر ونظر بلکہ ان کی فکری صالحیت کا آئینہ دار ہے۔اپنی اس تحریر میں وہ ہمیں ایک مصلحِ اُمت اور مفکرِ اسلام نظر آتے ہیں۔ارقام فرماتے ہیں:

''عیسائی لوگ مسجدِ نبوی ﷺ میں ہی نماز اپنے طریق پر پڑھیں اور آنحضرت (فداہ روحی) خاموش رہیں اور باوجود قدرت کے کچھ نہ کہیں۔ وائے بر حالِ ما کہ ہم ایسے نبی کی اُمت ہیں، جو غیروں کو بھی اپنی مسجد سے منع نہ کرے۔ ہم ایک فریق دوسرے بایں جرم کہ ہمارے طریق کے خلاف نماز کیوں پڑھتا ہے۔ گو مسلمان ہے مسجد سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اتنی ہی بات پر قناعت نہیں بلکہ کچہریوں میں غیر مسلموں سے اس امر کا فیصلہ کراتے ہیں کہ کونسا فریق مسجد میں رہنے کا حقدار ہے۔''(۲۷)

(8)

تفسیرِ ثنائی میں ایسے مسائل سے اجتناب برتا گیا ہے جن سے مسلکِ فقہا اور مسلکِ اہلحدیث (غیر مقلدین) کے مابین اختلافات کو بلاوجہ ہوا دی جاتی ہے۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں شاہ عبدالحق حقانیؒ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں انہوں نے ان لوگوں کا ردّ لکھا تھا، جو خود کو غیر مقلد اور اہلحدیث کہتے ہیں۔ (۲۸) مولانا امرتسریؒ نے حقانی صاحبؒ کی باتوں کا جواب دیکر لکھا ہے کہ ''یہی وجہ ہے کہ ہم نے تفسیرِ ہذا میں ان مسائل پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔''(۲۹)

قرات خلف الامام پر مولانا امرتسریؒ نے نہایت دقیق علمی بحث کی ہے۔ گو اس بحث سے قبل انہوں نے معذرت طلب کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہمارا طریقِ عمل تفسیر کے متعلق ہم کو اس تحریر کی اجازت نہ دیتا تھا مگر چونکہ ایک ہی کام کیلئے مختلف نیتیں ہوسکتی ہیں جو اپنا اپنا الگ الگ اثر دکھاتی ہیں۔ اس لئے بہ نیت نیک اپنے نزدیک راجح مذہب کا اظہار کرنا کچھ معیوب نہیں۔''(۳۰)

یہ بحث (وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ) والی آیت کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس بحث میں مولانا امرتسریؒ کا اندازِ استدلال خالصتاً فنی وعلمی ہے، جسے اصولِ فقہ کی فنّی بحثوں کے واقف کار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ اردو خوانوں سے معافی کے خواستگار بھی ہوئے ہیں۔ آٹھ صفحات پر

مشتمل یہ بحث علماء کے پڑھنے کے لائق ہے۔اس اختلافی بحث میں مخالفت وعناد کا پہلوتو کجا کہیں شوشہ بھی نظر نہیں آتا۔علمی موضوعات میں علماء کا باہم اختلاف ہوتا ہی رہتا ہے۔مگر اختلافِ رائے کرنا کوئی مولانا سے سیکھے۔مولانا کو اپنے دلائل اور اسلوبِ بیان کی صحت پر اعتماد ہی تو تھا جو یہ لکھ گئے۔

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اپنے مدعا کی اثبات میں کسی مغالطے یا سفسطے سے کام نہیں لیا، امید ہے قارئین اگر ہماری معروضہ بالا تقریر کو بغور پڑھیں گے۔مذہب میں متفق اللفظ نہ ہوں گے تو تقریر کے طرزِ استدلال کے محسّن ضرور ہوں گے۔''(۳۱)

(9)

مولانا مناظرِ اسلام مانے جاتے تھے مگر وہ روایتی اسلوب سے مختلف مناظر تھے۔بالعموم مناظروں کے ہاں علمی گہرائی نہیں ہوتی،اس لئے وہ اپنے لفظوں میں جوش پیدا کرنے کیلئے عامیانہ بلکہ سوقیانہ سطح پر آجاتے ہیں اس کا سبب دراصل ان کا غیر علمی پس منظر ہوتا ہے۔مگر مولانا امرتسریؒ کے مناظرے اعلیٰ پائے کے علمی اور تہذیبی الفاظ ودلائل سے مالا مال ہوتے تھے۔اس ضمن میں ان کا موقف تھا:

''یہ ایک نہایت پاکیزہ اصول ہے کہ مناظرہ میں فریقِ ثانی کے بزرگوں کو انہی لفظوں سے یاد کرنا چاہئے،جن لفظوں سے ہم اپنے بزرگوں کا نام سننا چاہتے ہیں۔افسوس ہے کہ زمانۂ حال میں اس طریق کی گفتگو بہت ہی کم ہوتی ہے، جس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔''(۳۲)

(10)

مولانا امرتسریؒ ردِّ قادیانیت میں عالم گیر شہرت کے حامل ہیں۔تفسیرِ ثنائی میں انہوں نے ان کے ردّ میں جگہ جگہ بحث کی ہے۔ایک جگہ لکھا ہے:

''مضمون وفات وحیات مسیح قادیانی مباحث کیلئے فیصلہ کُن نہیں۔ فیصلہ کُن وہی صورت ہے، جو خود مرزا صاحب نے میرے حق میں

بذریعۂ اشتہار مؤرخہ ۱۵/اپریل ۱۹۰۷ء کو شائع کی تھی، جس کا خلاصہ دوحرفہ مرزا صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

''مگر یہ دعویٰ مسیح موعود ہونے کا محض میرے نفس کا افتراء ہے اور میں تیری (خدا کی) نظر میں مفسد اور کذّاب ہوں اور دن رات افتراء کرنا برا کام ہے تو اے میرے پیارے مالک! میں عاجزی سے تیری جناب میں دعا کرتا ہوں کہ مولوی ثناءاللہ صاحب کی زندگی میں مجھے ہلاک کر اور میری موت سے ان کو اور ان کی جماعت کو خوش کر دے۔''

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ مرزا صاحب موصوف اس اشتہار کے ایک سال دو ماہ گیارہ روز بعد ۲۶/مئی ۱۹۰۸ء کو میری زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ "فالحمد للّٰہ الذی أظهر الحق و أبطل الباطل بكلماته۔"(۳۳)

اس عبارت سے جہاں مولانا امرتسریؒ کی معرفت اسلام کی سچائی کا ناقابلِ تردید ثبوت ملتا ہے وہیں مرزا صاحب کیلئے بھی مولانا کے لفظوں کے معتدل استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا قادیانی اور مولانا امرتسریؒ کا تذکرہ مفتی احمد یار خان نعیمیؒ نے بھی اپنی تفسیر نور العرفان میں کیا ہے۔ (جو بریلوی مکتب کی اہم تفسیر مانی جاتی ہے) مناسب لگتا ہے کہ ان کے اقتباس کو بھی ذیل میں نقل کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں۔

''.....اس سے معلوم ہوا کہ تمام جھوٹوں میں بڑا جھوٹا وہ ہے، جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے۔ اسی لئے قانونِ قدرت ہے کہ دنیا پر اس کا جھوٹ ظاہر فرما دے۔ غلام احمد قادیانی نے جو بھی دعویٰ کیا۔ اس میں جھوٹا ہُوا۔ محمدی بیگم اس کے نکاح میں نہ آسکی۔ ثناءاللہ اس کی زندگی میں نہ مرے بلکہ وہ خود ثناءاللہ کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر ہلاک ہوا۔''(۳۴)

واضح رہے کہ تفسیر ثنائی جلد دوم جب لکھی جا رہی تھی، تب مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہوا تھا۔ ان

کے انتقال کا ذکر تفسیر ثنائی کے ایک حاشیہ میں اس طرح کیا گیا ہے۔''یہ فقرہ مرزا صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا افسوس ہے کہ آج ہم ان کو زندہ نہیں پاتے۔''(۳۵)

(11)

مولانا امرتسریؒ نے اپنی تفسیر میں اپنے لکھے ہوئے کو حرفِ آخر کبھی نہیں سمجھا۔ طبع دوم میں کہیں کہیں ہمیں ان کا یہ اعتراف نظر آتا ہے کہ پہلے اس کے معنیٰ وہ لکھے گئے تھے۔ مگر غور وفکر کے بعد اب اس کے یہ معنیٰ لکھے جا رہے ہیں۔ اس سے مولانا کے علمی و تحقیقی ذوق ورجحان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کی مثال ملاحظہ ہو۔

"وَبِئْسَ الْوَرِدِ الْمَوْرُوْد" ترجمہ: بہت ہی برا گھاٹ ہے اور بُرے اتارے ہوئے۔

المورود سے مراد وہ لوگ ہیں جو اورد کے مفعول بہٖ ہیں اور حرفِ عطف مخذوف ہے۔

ای بئس الورد المورود۔ بظاہر یہ لفظ **الورد** کی صفت ہے۔ طبعِ اوّل میں اسی کے موافق معنیٰ کئے ہیں لیکن بعد غور یہ معنیٰ اصح معلوم ہوئے۔''(۳۶)

(12)

مولانا امرتسریؒ ایک خداترس عالمِ دین تھے۔ تفسیر قرآن میں ان کی خداخوفی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ جہاں محسوس کرتے کہ تفسیر عام ڈھب سے ہٹ کر کرنا ضروری ہے۔ تو وہاں اس کی توجیہہ وتوضیح ضرور کرتے اور ساتھ ہی اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے کہ ممکن ہے کہ ''کسی صاحب کو اس سے بھی اچھی توجیہہ سوجھ جائے۔" وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْم "(۳۷)

مثلاً اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْبِیَاءَ وَ جَعَلَكُمْ مُلُوْكًا ......والی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''......اس نے تم میں سے انبیاء اور تم کو بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا۔''

اور نیچے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''حضرت موسیٰؑ کا یہ خطاب اُس وقت ہے، جبکہ وہ اور قوم ابھی میدان میں ہیں اور ابھی تک فلسطین (شام) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ اُس وقت سے پہلے بنی اسرائیل میں بادشاہ کوئی نہ ہوا تھا۔ جو ہوئے وہ بعد میں ہوئے۔ اس لئے اس آیت میں جَعَلَ اپنے اصلی معنیٰ میں چسپاں نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں نے اس کی وعدے سے تفسیر کی ہے، ممکن ہے کہ کسی صاحب کو اس سے بھی اچھی توجیہہ سوجھ جائے۔''(۳۸)

مولانا کا آخری جملہ بار بار پڑھنے کے لائق ہے (ممکن ہے کسی صاحب کو اس سے اچھی توجیہہ سوجھ جائے) یہ وہ ترغیب ہے، جو قرآن فہمی کا جذبہ بیدار کرتی ہے، تحقیق وجستجو کو بڑھا دیتی ہے۔ اب ایسے علماء کہاں؟ جو اپنی بے پناہ علمی بصیرت کے باوجود، خود کو بے مایہ ظاہر کریں اور لوگوں میں قرآنی فہم کی ضرورت کا احساس دلائیں اور انہیں تدبر کی راہ پر ڈالیں۔

(13)

مولانا معروف معنیٰ میں اہلحدیث تھے۔ مگر انہوں نے تفسیر کے ایک مقام پر جو طریقۂ نماز بیان کیا ہے اُسے پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ مولانا کا طریقۂ نماز غالباً اہلحدیثوں والا نہیں تھا۔ اسلیئے انہوں نے داخلۂ نماز کیلئے، ایک مرتبہ تو رفع یدین کا ذکر کیا ہے۔ پھر اس کے بعد سلام پھیرنے تک پوری نماز بیان کی ہے۔ اور درمیان میں کہیں بھی دوسری مرتبہ رفع یدین کا ذکر نہیں کیا ہے۔(۳۹)

(14)

شانِ نزول کی روایات کو قرآنِ مجید کی روشنی میں پرکھنے کا اصول مولانا امرتسریؒ نے نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ اصول ہے، جسے قریب قریب ہر شانِ نزول کے ساتھ منطبق کرنے کی ضرورت ہے۔ ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاء إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْأَلُوا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَلَكُمْ''۔ والی آیت کے تعلق سے بیان کردہ روایات پر انہوں نے جرح کی ہے اس سے ان کی تنقیدی صلاحیت، روشن خیالی، بالغ نظری، اور فکری توانائی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کی بحث ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''اس آیت کے شانِ نزول میں چند روایات منقول ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک یوں ہے کہ ایک لڑکے کی پیدائش کی نسبت بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ناجائز مولود ہے۔اس نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا میرا باپ کون ہے؟ آنحضرت نے وہی بتایا، جو اس کی والدہ کا ناکح تھا۔بس فیصلہ ہوگیا۔راوی کہتا ہے اس واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی مگر دقیق نظر میں یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے۔وہ یوں ہے کہ آیت کے سارے لفظوں سے دو جملے حاصل ہوتے ہیں۔(۱) جو سوال تم کرو گے، اس کا جواب تم کو تکلیف دہ ہوگا۔(۲) نزولِ قرآن کے وقت اگر سوال کرو گے تو جواب ضرور ملے گا۔ان دو جملوں سے نتیجہ نکلتا ہے کہ سوال کا جواب قرآنِ مجید میں دیا جائے گا۔نیز یہ کہ وہ جواب تم کو تکلیف دہ ہوگا۔حالانکہ جو جواب اس سائل کو ملا۔وہ قرآن میں نہیں۔نہ تکلیف دہ ہے۔بلکہ تسلی بخش اور فیصلہ کن ہے۔پھر یہ روایت اس آیت کی محلِ نزول نہ ہوگی۔ بلکہ محلِ نزول یہ ہے کہ صحابہ کفار سے تنگ آ کر جہاد کی اجازت چاہتے تھے اور مصلحتِ الٰہی میں ابھی وقت نہ آیا تھا۔ان کو سمجھانے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔چنانچہ اس آیت کے ساتھ ہی پہلے لوگوں کا ذکر ہے۔جنہوں نے جہاد کی بابت عرض معروض کیا تھا۔''ابْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' (ہمارا افسر مقرر کیا جائے تو ہم اللہ کی راہ میں لڑیں) جب ان کی درخواست منظور ہوئی تو منہ پھیر گئے۔ میرے نزدیک آیت کے یہ معنیٰ ہیں۔ رہی روایات، سو وہ سنداً صحیح ہیں۔یعنی واقعہ ایسا ضرور ہوا کہ بعض لوگوں نے سوال کئے لیکن سوالوں کو اس آیت سے متعلق کرنا یہ راوی کا فہم ہے۔ایسا ہوا کرتا ہے کہ ایک راوی محض اپنے فہم سے کسی واقعہ کو

آیت کا محل نزول سمجھ کر بیان کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالہ فوز الکبیر میں ایسا لکھا ہے۔ اللّٰہ اعلم"۔(۴۰)

(15)

مولانا امرتسریؒ نے بعض مقامات پر ایسی تفسیر کی ہے، جو اپنے وقتِ تحریر یا زمانۂ تصنیف کی داخلی شہادت بھی فراہم کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک مثال ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

سورۂ سبا کی آیت ہے: وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ .....

ترجمہ: سلیمان کے لئے ایک خاص قسم کی ہوا کو ہم نے مسخّر کر دیا تھا، جو صبح کے وقت ایک مہینے کی سیر کی مسافت چلی جاتی تھی اور شام کو ایک مہینے جتنا۔ (امرتسریؒ)

مولانا نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے حضرت سلیمان کے اس واقعہ کو خلافِ قدرت جان کر تاویلِ بعید کی ہے مگر خدا تعالیٰ دن بدن ایسے لوگوں کو جواب دینے کے لئے دانایانِ فرنگ کو سوجھا دیتا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی ایسی ایجاد کر دیتے ہیں کہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدرت کے اسرار ہنوز بہت کچھ مخفی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ معلوم ہونا اب شروع ہوئے ہیں۔ آج کل یورپ میں ایک ایجاد ہوئی ہے، جس کا نام ہے "ہوائی جہاز"۔ یہ جہاز ہوا میں اُڑتا ہے۔ دور دراز ممالک کا کیا ذکر۔ ۱۹۱۰ء میں بمقام الہ آباد، جو نمائش ہوئی۔ اس میں بھی وہ جہاز اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بھی وہ لایا گیا۔ اس بیان کے بعد اب تو ہوائی جہاز کو اتنی ترقی ہوئی ہے کہ ولایتِ انگلستان سے ہندوستان میں ایک ہفتہ میں ڈاک بلکہ انسانوں کو بھی سوار کر کے لاتا ہے۔ آج سے پہلے بھی ہوا میں پرواز کا ایک آلہ تھا، جس کا نام غبارہ تھا۔ حضرت

سلیمان کا تخت بھی غالباً اسی قسم کی ہوا سے اُڑتا ہوگا۔ جس کو خلافِ قانونِ قدرت کہہ کر انکار یا تاویل کرنا ذرہ جلد بازی ہے۔ امام رازی تفسیرِ کبیر میں لکھتے ہیں: المسخر لسلیمان کانت ریحاً مخصوصته لا هذه الرّیاح فانها لمنافع عامة فی اوقات الحاجات (تفسیرِ کبیر، جلد ۷، ص ۹) یعنی حضرت سلیمان کے تابع یہ ہوا نہ تھی، جو ہمارے سامنے چل رہی ہے۔ کیونکہ یہ تو عام لوگوں کے فائدے اور منافع کیلئے ہے۔ اسلیئے ہم نے اس کو غبارہ سے تشبیہ دی ہے، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِاِسْرَارِهٖ". (۴۱)

اس طرح اس آیت پر بھی ان کی تفسیر دیکھئے:

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهٖ (الشوریٰ ۳۳)

اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا لے پھر وہ جہازات سمندر میں کھڑے رہ جائیں۔ (امرتسریؒ)

اس آیت کے ذیل میں مولانا نے ایک اشکال اُٹھایا ہے، جو ان کے اپنے عہد کے تناظر میں پیدا ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا نہایت عمدگی سے جواب دے دیا۔ اس طرح اپنی تفسیر کو اپنے زمانے سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کا جواب دیکھئے۔ ''یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آج کل جہاز ہوا سے نہیں چلتے بلکہ انجنوں کی طاقت سے چلتے ہیں۔ پھر ہوا کے رکنے سے ان پر کیا اثر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انجنوں کی بھاپ بھی ہوا ہی ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں الریح کا لفظ اُس ریح کو بھی شامل ہے۔''(۴۲)

(16)

قرآنِ مجید کے بارے میں بلا شبہ درست دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر معاشرے کے لئے ہے۔ یہاں تک کہ صبحِ قیامت تک کے لوگوں کے لئے بھی اس میں سامانِ ہدایت وعبرت موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض آیتوں کے شانِ نزول کو زمانۂ حال پر منطبق کرنے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ جبکہ مولانا امرتسریؒ کے ہاں ایسا استدلال بھی نظر آتا ہے کہ دورِ رسالت مآب ﷺ کے واقعہ کو کسی حالیہ واقعہ پر بطور پیش گوئی منطبق کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ ''اس آیت سے اس ہندی واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔''(۴۳)

اس اجمال کی تفصیل کیلئے پہلے آیت دیکھیئے۔ پھر اس پر مولانا کا ترجمہ اور حاشیہ۔

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعاً إِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ...... (الحشر/۱۴)

یہ لوگ تم مسلمانوں سے سامنے ہو کر نہ لڑیں گے۔ ہاں قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے سے لڑیں گے۔

جمہور کے نزدیک اس آیت کا مصداق یا شانِ نزول یہود ہیں۔ مگر مولانا نے ہندوستان کے بعض متشدد ہندوؤں کو بھی اس آیت کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"ہندوستان میں آریہ قوم نے برخلاف دستور ہندوؤں کے شُدھی کا رواج دیا، جس سے مطلب ان کا یہ تھا کہ غیر ہندوؤں کو ہندو بنایا جائے۔ اس تحریک شُدھی سے ہندو اور مسلمانوں میں ملک کی بدقسمتی سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تو باہمی جنگ و فساد تک نوبت پہنچی۔ اس باہمی جنگ میں ہندوؤں نے طریقِ جنگ یہ اختیار کیا کہ مسلمان جب ان پر حملہ آور ہوں تو وہ اپنے مکانوں پر سے ان پر اینٹیں برسائیں اور دیواروں کی اوٹ میں چُھپے رہے، اس آیت سے اس ہندی واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔"(۴۴)

(17)

تفسیرِ قرآن لکھتے وقت کے تاثرات و مشاہدات بھی بعض مقامات پر تفسیر کا حصہ بن گئے ہیں۔ مثلاً مولانا امرتسریؒ جب اس آیت پر پہنچے۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْن. (الذاریات/۵۸)

ترجمہ: اللہ بڑا ہی رزق دینے والا، قوت والا زبردست ہے۔ (امرتسریؒ)

تو حاشیہ میں وقتِ تحریر کی فضا اور ماحول کو بھی قلمبند کر گئے۔ ملاحظہ کیجئے۔

"آج ۷/ستمبر ۱۹۲۱ء کو میں اس آیت کی تفسیر کر رہا ہوں۔ ابر محیط ہے۔ بارش کی سخت ضرورت ہے۔ قحط نمودار ہے۔ آئندہ کو قحط کا مزید خطرہ ہے کہ یکا یک خدا کی رحمت نے برمحل نزول فرمایا تو میرے دل میں اس آیت کی تفسیر جو پہلے تھی۔ اس مشاہدے سے

مزید مضبوط ترین ذہن نشین ہوگئی کہ واقعی خدا بڑا رزاق ہے۔ جو
ایک بارش سے کروڑھا بندگان اور حیوانات کو رزق دے رہا
ہے۔''(۴۵)

اور جب مولانا امرتسریؒ اس آیت پر پہنچے۔

وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاء ثَجَّاجاً (النبا/۱۴)

ترجمہ: بادلوں سے زور کا پانی اتارتے ہیں۔ (امرتسریؒ)

تو اپنے حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں۔'' عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت دمِ تحریر ہٰذا امرتسر میں خوب بارش ہورہی تھی، جس کی اشد ضرورت تھی۔ (۲ ستمبر ۱۹۳۰ء)(۴۶)''

تفسیرِ آیات کی تدبیر کائنات سے ہم آہنگی کیا عجب لطف دیتی ہے۔ جب تحریر کے وقت، مصنف قولِ خدا کو فعلِ خدا سے ہم آہنگ ہوتا ہوا دیکھے۔ سبحان اللہ!

(18)

مولانا امرتسریؒ کی وسیع القلبی والمشربی کی مثال اس امر سے خوب ظاہر ہوتی ہے کہ باوجود مسلکِ اہلحدیث سے پیدائشی وعمومی تعلق رکھنے کے، وہ صوفیائے کرام کا ذکر جس عقیدت سے کرتے ہیں وہ بھی خوب ہے۔

ایک جگہ حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

''صوفیائے کرام رضوان اللہ اجمعین نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے
کلمات طیبات کو ایسی توجہ سے پڑھنا چاہئے کہ قائل ہر ایک لفظ پر
رب العٰلمین کے جواب کو گویا سنتا ہے۔ صفائی قلب کیلئے اعلیٰ درجہ
کا عمل ہے۔ اللھم ار زقنی۔''(۴۷)

اس سے مولانا کے متصوفانہ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ نیز صوفیائے کرام کیلئے رضوان اللہ اجمعین کے کلمۂ دعائیہ سے ان کی عقیدت کا بھی اندازہ ہوتا ہے..... مگر اس کے باوجود وہ اپنے زمانے کے پیروں کی گمراہی اور ان کی جہالت کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔

''ایک دفعہ بعض یہودی اپنے بچوں کو اٹھا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے اور پوچھا کہ بتلایئے ان پر بھی کوئی گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بولے اسی طرح ہم بھی گناہوں سے صاف ہیں۔ ہمارے دن کے گناہ رات کو محو ہو جاتے ہیں اور رات کے دن کو، اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ راقم کہتا ہے کہ زمانۂ حال کے بعض پیر اسی طرح اپنی شیخیاں بگھارتے اور خدا سے مردود ہوتے ہیں۔ ان آفتوں کی جڑ حُبِّ دنیا ہے۔ (نعوذ باللہ)''(۴۸)

(19)

متعدد مقامات پر اہلِ تشیع کا عالمانہ اور مہذبانہ انداز میں ردّ لکھنے کے باوجود مولانا نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو علی علیہ السلام (۴۹) حضرت فاطمہؓ کو علیہا السلام لکھا ہے۔ لکھتے ہیں: جنابہ سیدۃ النسآء فاطمۃ الزہراء (علی ابیہا وعلیہا السلام) (۵۰) اور حسن بن علیؓ کو امام حسن علیہ السلام (۵۱) اور حسین بن علیؓ کو امام حسین علیہ السلام لکھا ہے۔ (۵۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تفسیر میں جو یہ لکھا ہے کہ ''فریقِ ثانی کے بزرگوں کو انہی لفظوں سے یاد کرنا چاہئے، جن لفظوں سے ہم اپنے بزرگوں کا نام سننا چاہیں۔''(۵۳) تو انہوں نے اپنا یہ قول سچ کر دکھایا ہے۔

(20)

مولانا امرتسریؒ نے سلطان محمود غزنوی کو رضی اللہ عنہ وارضاہ کے کلمۂ دعائیہ کے ساتھ یاد کیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے۔

''سلطان محمود کے کلمات پر نظر کرنے سے مجبوراً یہ دعاء منہ سے نکلتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہر مسلمان ایسے پُر جوش دیندار کے نام پر یہ کلمہ کہا کرے گا۔ کیونکہ شرع میں اس کی خصوصیت کسی قوم یا شخص کے ساتھ نہیں، عموماً فقہاء حتیٰ کہ صاحبِ ہدایہ کی نسبت بھی اس کا استعمال آیا ہے۔''(۵۴)

مولانا امرتسریؒ نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اُستاذ الہند کا لقب دیتے ہوئے اُن کا نام اس طرح تحریر کیا ہے ''استاذ الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ''(۵۵) اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو حجۃ الہند کے لقب سے یاد کیا ہے۔ (۵۶)

(21)

مولانا نے اپنی تفسیر میں نیچریت کا ردّ بیشتر مقامات پر کیا ہے۔ اور شروع کی جلدوں میں تو کچھ زیادہ ہی کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سرسید احمد خانؒ کا حوالہ بھی کثرت سے دیا ہے۔ مگر ہر جگہ ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ کہیں سید احمد خان مرحوم لکھا(۵۷) کہیں سید صاحب مرحوم (۵۸) کہیں ''معزز مخاطب سرسید احمد خاں مرحوم''(۵۹) اور کہیں ''سرسید احمد خاں عفی اللہ عنہٗ(۶۰) وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ شاید یہی سبب رہا ہو کہ جب مولانا امرتسریؒ کا مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے کسی مسئلے میں ردّ لکھا تو انہوں نے بھی مولانا امرتسریؒ کا اکرام کرتے ہوئے انہیں نہ صرف مولانا لکھا۔ بلکہ مولانا سے پہلے گرامی منش بھی لکھا۔ پھر ان کا نام لکھا۔ یعنی ''گرامی منش مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ(۶۱) گرامی منش کا مطلب ہے ''بزرگ طبیعت''(۶۲) حالانکہ مولانا بریلویؒ بڑے بڑے علماء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اور جنہیں پسند نہیں کرتے تھے، انہیں کبھی بھی لفظ مولانا سے یاد نہیں کرتے تھے۔

(22)

تفسیرِ ثنائی میں اردو، عربی اور فارسی اشعار کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ اس سے مولانا کے ذوقِ لطیف اور حسِ جمالیات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تفسیر میں سب سے پہلا شعر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

اور تفسیر کے اختتام پر جو اشعار لکھے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

الا اے خردمند فرخندہ خوی
ہنر مند نشیندہ ام عیب جوی
قباگر حریر است گر پر نیاں

بنا چار حشوش بود درمیاں
تو اگر پر نیانی بایذا مکوش
کرم کار فرماؤ حشوم بیوش

مولانا کے مستعمل اشعار پر مشتمل ایک الگ مقالہ اپنے ماله وما علیه کے ساتھ معرضِ تحریر میں آ سکتا ہے۔

(23)

مولانا امرتسریؒ نے اپنی تفسیر کی آٹھ جلدوں میں سے پانچ جلدوں کا اختتام کلماتِ دعائیہ پر کیا ہے۔جس کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی جلد کے اختتام پر لکھا گیا ہے۔ اللھم اغفر لکاتبہٖ ولمفسرہٖ ولوالدیھما ولکل من سعیٰ فیہ۔(۶۳)

دوسری جلد کے خاتمہ پر لکھا گیا ہے۔ اللھم اھدنا فیمن ھدیت۔
اللھم اغفرلی لمولفہٖ و بارك فی عمرہٖ ولمن سعیٰ فیہ (۶۴)

چوتھی جلد کے اختتام پر لکھا گیا ہے۔ اللھم اغفر لمولفہٖ ولکاتبہٖ ولمن سعیٰ فیہ برحمتك یااللّٰہ۔(۶۵)

ساتویں جلد کے خاتمہ پر لکھا گیا ہے۔ اللھم اغفر لکاتبہٖ ولمصنفہٖ ولمن سعیٰ فیہ

اور آٹھویں جلد کے اختتام پر لکھا گیا ہے۔

آج ۲۹ رمضان ۱۳۴۹ھ بمطابق ۱۸ فروری ۱۹۳۱ء کو مسودہ یہاں تک پہنچا۔ له الحمد۔
الحمد للّٰہ الذی بتو فیقہٖ تتم الصالحات، ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔(۶۶)
خادم دین اللّٰہ ، ابو الوفا ثناء اللّٰہ (کفاہ اللّٰہ) امرت سری

تفسیرِ ثنائی کے تعلق سے یہاں چند پہلو اجمال کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ان پہلوؤں سے ہٹ کر بھی تفسیر ثنائی میں بہت کچھ ہے، جسے الگ سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر چند پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔مزید پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی خواہش ضرور ہے۔ان پہلوؤں میں ایک پہلو محلِ

نظر مقامات یعنی تنقیدات کا بھی ہے، جن پر راقم کا اپنا نقطۂ نظر ہے لیکن اسے تمام پہلوؤں کے بعد لکھا جائے گا۔ ان شاء اللّٰہ وما توفیقی الا باللّٰہ ۔

حواشی وحوالہ جات

(۱)　بحوالہ ص ۳، زیرِ عنوان: التماسِ مصنف، حصہ اوّل، تفسیرِ ثنائی

(۲)　جلد: ۸، ص ۱۸۴

(۳)　جلد ۸، ص ۱۸۴

(۴)　جلد اوّل، ص ۲۰

(۵)　بحوالہ جلد اوّل، ص ۵۸

(۶)　مقدمہ، ص ۳

(۷)　ص ۳، زیرِ عنوان: التماسِ مصنف

(۸)　مقدمہ تفسیر ثنائی۔ ص ۱۶

(۹)　بحوالہ: جلد ۲، ص ۳۴۔۸۰۔۸۵۔۱۰۳۔۱۰۹، جلد ۳، ۱۵۴۔۱۶۲۔۱۶۶۔ جلد ۴/۱ وغیرہ

(۱۰)　بحوالہ: جلد ۱۵۳

(۱۱)　مقدمہ۔ ص ۴

(۱۲)　جلد ۱۔ ص ۱۹

(۱۳)　جلد ۱، ص ۱۹

(۱۴)　جلد ۴، ص ۱۴۶

(۱۵)　جلد ۴، ص ۱۶۸

(۱۶)　جلد ۵، ص ۶۷

(۱۷)　جلد ۵، ص ۸۲

(۱۸)　جلد ۶، ص ۱

(۱۹)　جلد ۶، ص ۲۴

(۲۰)　جلد ۶، ص ۴۶

(۲۱)　جلد ۷، ص ۴۸

(۲۲)　جلد ۷، ص ۸۱

(۲۳)　جلد ۷، ص ۱۶

(۲۴)　جلد ۸، ص ۹۰

(۲۵)　جلد ۸، ص ۱۷۵

(۲۶)　جلد ۸، ص ۱۲۲

(۲۷)　جلد دوم، ص ۱

(۲۸)　جلد ۲، ص ۱۲۷

(۲۹)　جلد ۲، ص ۱۲۸

(۳۰)　جلد ۳۔ ص ۱۷۷

(۳۱)　جلد ۳، ص ۱۸۳

(۳۲)　جلد ۳، ص ۸۸

(۳۳)　جلد ۲، ص ۹۰۔۹۱

(۳۴)　حاشیہ زیرِ آیت ۹۳، الانعام، ص ۲۲۱

(۳۵)　جلد ۲، ص ۸۴

(۳۶)　جلد ۴، ص ۱۰۵

(۳۷)　جلد ۳، ص ۱۱

(۳۸)　جلد ۳، ص ۱۱

(۳۹)　جلد اوّل، ص ۱۰۷۔۱۰۸

(۴۰)　جلد ۳، ص ۴۰

(۴۱)　جلد ۶، ص ۱۵۸۔۱۵۹

(۴۲)　جلد ۷، ص ۹۲

(۴۳)　جلد ۸، ص ۴۶

(۴۴) جلد ۸، ص ۴۶

(۴۵) جلد ۷، ص ۱۹۰

(۴۶) جلد ۸، ص ۱۴۰

(۴۷) جلد ۴۔ ص ۴۴

(۴۸) جلد ۲، ص ۱۲۲

(۴۹) جلد ۱، ص ۱۳۰

(۵۰) جلد ۲، ص ۱۰۱

(۵۱) جلد ۲، ص ۳۵

(۵۲) جلد ۴۔ ۱۹۹

(۵۳) جلد ۳، ص ۸۸

(۵۴) جلد ۱، ص ۶۳

(۵۵) جلد ۶، ص ۹۵

(۵۶) جلد ۱، ص ۱۱۸

(۵۷) جلد ۱، ص ۱۳۴

(۵۸) جلد ۳، ص ۱۴۶

(۵۹) جلد ۴، ص ۱۱۰

(۶۰) جلد ۱، ص ۱۲۰

(۶۱) فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۵، رضا فاؤنڈیشن جامعہ رضویہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور، ص ۸۸، اشاعت ۱۹۹۹ء

(۶۲) علمی اردو لغت (جامع) وارث سرہندی، علمی کتاب خانہ، کبیر اسٹریٹ روڈ، اردو بازار، لاہور، طبع ۲۰۰۰ء

(۶۳) جلد اوّل، ص ۱۸۴

(۶۴) جلد دوم، ص ۱۶۲

(۶۵) جلد چہارم، ص ۲۰۶

(۶۶) جلد ہشتم، ص ۱۸۴